وفیات

مولانا محمد رضوان القاسمی جامع کمالات شخصیت

مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی

وہ ماہِ شعبان کی 26 تاریخ (1425ھ) تھی اور اکتوبر کی 11 (2004ء)، امریکا میں صبح کے 4 بجے تھے کہ حیدرآباد سے بذریعہ فون حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی، ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی، خبر سن کر دل دھک سے ہوگیا، دل کو یارائے ضبط نہ رہا، اشکبار آنکھوں کے ساتھ زبان پر وہی قرآنی ورد جاری ہوگیا جو صحائفِ کائنات میں بے نظیر اور غم وحزن کے بار کو ہلکا کرنے کا عارفانہ اور تیر بہدف نسخہ ہے یعنی ﴿انا للّٰہ وانا الیہ راجعون﴾ دماغ کی...... شریانوں میں انجماد خون کے باعث دماغ کی سرجری کی گئی، اس کے بعد ان پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا، صحت وعمر درازی کے لیے کتنی دعائیں کی گئیں اور علاج ودوا کی ہر تدبیر کی گئی، مگر تقدیر کی مجبوری دیکھیے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی اور وقعت الواقعۃ (ہونے والی بات ہوکر رہی)۔

مولانا محمد رضوان قاسمیؒ (1944-2004ء) سے راقم الحروف کا تعلق قریبی اور ہمہ وقتی تھا، اس تعلق کی ابتدا ہوئی طالب علمی کے ابتدائی دور سے جب کہ میں پورے طور پر سن شعور کو بھی نہ پہنچا تھا، پھر طالب علمانہ دور سے فراغت (روایتی اور اصطلاحی معنیٰ میں) کے بعد یہ تعلق رفتارِ وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتا چلا گیا، یہ تعلق تدریسی ذمہ داریوں کی نسبت سے بھی تھا اور مولانا کے تصنیفی، تالیفی اور قلمی وتحریری امور میں معاونت وخدمت کی نسبت سے بھی، علمی اور دعوتی اسفار میں رفاقت کا تعلق بھی اور مولانا کی معیت میں ملی اور اجتماعی امور ومسائل سے متعلق مجالس میں شرکت کا بھی، افسوس کہ آج قلم اس مجسمہ علم وتحقیق اور پیکر ادب ودانش کے ماتم اور اس کے لیے اظہار رنج والم پر مجبور ہے جس کے وصف ومدح کا فرض بارہا ادا کرنا پڑا ہے اور جس شخصیت کے لیے مدظلہ اور دامت برکاتہم جیسے الفاظ لکھے اور بولے جاتے تھے آج اس کے لیے دعائیہ کلمات اس طرح ادا کرنے پڑ رہے ہیں، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

دارالعلوم دیوبند نے جتنے کارآمد رجال علم ودین اور مردانِ کار پیدا کیے ان میں مولانا کی ذات امتیازی حیثیت کی حامل تھی، وہ ایک مخلص داعی وخطیب، مایہ ناز صاحب علم وقلم، صاحب طرز ادیب وانشا پرداز، نکتہ رس محقق

وباکمال مؤلف، جہاں دیدہ اور باخبر عالم دین، مشفق معلم واستاذ اور وسیع النظر مصلح ومربی تھے، وہ ان علما میں سے تھے جو خود اپنی فکر اور اپنی نظر رکھتے ہیں، وہ محرم اسرارِ دین تھے، رموز وحقائق سے پردہ اٹھانے کا فن جانتے تھے، معانی ومعارف کی نہریں ان کی زبان اور قلم سے جاری رہتی تھیں، وہ اپنی تقریر وتحریر سے حکمت ودانائی کے موتی بکھیرتے تھے، جو لوگ ان کو سنتے یا پڑھتے، اپنے دماغ کو روشن پاتے اور دل میں سوز وگداز محسوس کرتے، ان کی شخصیت جامعیت اور توازن واعتدال کا نمونہ تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات میں فکر ونظر کے محاسن اور علم وفہم کی ساری خوبیاں جمع کردی تھیں اور یوں اپنی ذات میں وہ ایک انجمن اور اپنی شخصیت میں عالم کی مثال بن گئے تھے اور خدا سے یہ محال نہیں کہ دنیا کو ایک ذات میں جمع کردے۔

ولیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

مولانا نے دارالعلوم دیوبند کے علمی ماحول میں تربیت پائی اور اس کے یگانہ روزگار اور اپنے وقت کے باکمال اساتذہ سے اکتساب فیض کیا، خصوصیت کے ساتھ دارالعلوم کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ (1897-1983ء) کا اعتماد انہیں حاصل تھا اور وہ ان کی قابلیت، صلاحیت، علمی استعداد، فطری ذکاوت اور فکری پختگی کے پورے طور پر معترف تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے دارالعلوم کے جوہرِ قابل کی ہمہ جہتی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے حیدرآباد کے علمی وادبی ماحول اور علم دوست اور علما نواز سرزمین کا انتخاب کیا۔

12 جون 1969ء کو مولانا مرحوم نے پہلی دفعہ حیدرآباد کی سرزمین پر قدم رکھا، ایک تحریر ساتھ تھی جو حضرت حکیم الاسلامؒ کی طرف سے بعض معززینِ شہر کے نام تھی، قلب میں واقع مسجد عامرہ میں امامت وخطابت اور درس قرآن وحدیث سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا، مولانا فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے روحانی نسبت رکھنے والی درس گاہ دارالعلوم الرحمانیہ جس کا تعلیمی، دعوتی اور اصلاحی فیضان آج بھی پوری قوت کے ساتھ بہ فضلِ رحمٰن جاری ہے، میں کچھ عرصہ کے لیے تدریسی خدمت انجام دی، تاہم مولانا کے فکر وتخیل کی سطح نہایت بلند تھی، طبیعت میں نشاط تھا، حوصلہ مندی تھی، کچھ کرگزرنے کی امنگ اور آرزو دل میں مچلتی تھی، پھر فکر جوان اور علم تازہ تھا، ادھر تقدیر الٰہی بھی یہی تھی کہ آپ کی ذات سے علم وعرفاں کے ایک ایسے مرکز کی بنا ڈالی جائے جس سے ملک وملت کو علمی وفکری رہنمائی ملتی رہے، چناں چہ مولانا مرحوم اور حیدرآباد کی ممتاز دینی ودعوتی شخصیت الحاج سید ضیاء الرحمٰن (وفات: 1993) نے اپنے دوسرے رفقا ومعززینِ شہر کے باہمی تعاون کے ساتھ 1972ء مطابق 1393ھ میں دارالعلوم سبیل السلام کی بنیاد رکھی پھر مولانا مرحوم اس چمنِ کی آبیاری میں پوری طرح مصروف ہوگئے اور یوں حیدرآباد ان کے فکر وعمل کی جولان گاہ بنا اور یہی ان کا مرقد اور آخری اور ابدی آرام گاہ بن گیا، خدا ان کی روح کو اپنی لازوال مغفرت کی دولت

سے مالا مال کر دے۔

مولانا مرحوم پیدا تو صوبہ بہار کے ضلع دربھنگہ میں ہوئے، لیکن حیدرآباد سے انہیں تعلق خاطر تھا، یہاں کا علمی، دینی اور ادبی ماحول اور امن ومحبت کی فضا انہیں پسند تھی، اسی لیے تعلیمی فراغت کے بعد دینی ودعوتی مقاصد کے لیے انہوں نے حیدرآباد کا جو رُخ کیا تو پھر وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے اور اس شہر کی علمی فیاضیوں، دینی روایات اور تہذیبی قدروں کی تاریخی تسلسل کی زینت بن گئے، مسجد عامرہ جو پہلے سے نامور علما واصحاب فکر وعمل کا مرجع اور دینی، دعوتی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہے، میں ان کے خطبات اور دروسِ قرآن وحدیث (مشکوٰۃ المصابیح) سے استفادے کے لیے لوگ ذوق وشوق سے حاضر ہوتے، عصری مسائل اور تقاضوں سے مربوط ان کے خطبات جمعہ، زمانہ آگہی، دینی بصیرت اور مومنانہ فراست کا نمونہ ہوتے تھے۔

دارالعلوم سبیل السلام، اس کا وسیع تر تعلیمی نظام اور اس کا تحقیقی، دعوتی اور تصنیفی وتالیفی کردار دراصل ان کے زرخیز دماغ، روشن فکر اور عالمانہ بصیرت کا آئینہ دار ہے، انہوں نے اپنے انتظامی رفقا، معاونین اور مخلص اساتذہ وکارکنان کے تعاون سے اس ادارہ کو ہمہ جہتی ترقی دی، ان کی فکر یہ تھی کہ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم سبیل السلام محض ایک تعلیم گاہ اور دینی درس گاہ نہ رہے بلکہ ملک وملت کو درپیش مسائل میں وہ دینی رہنمائی اور سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دیتا رہے، چناں چہ اس ادارہ کے زیر اہتمام علمی وفقہی مذاکرات اور دعوتی اجتماعات بھی ہوتے رہے اور ادبی سیمینار بھی، وعظ وارشاد کی مجلسیں بھی قائم ہوئیں اور شعر وسخن کی بزم بھی آراستہ کی گئی، اصلاح معاشرہ کا پیام بھی سنایا گیا اور خدمتِ خلق کی راہ بھی دکھائی گئی اور اپنی ان ہمہ گیر خصوصیات کی وجہ سے یہ دارالعلوم ملک کا ایک ممتاز دینی، تعلیمی ادارہ بن گیا۔

مولانا مرحوم کو شعر ادب سے فطری ذوق تھا، ان کی تحریریں، زور وقوت، دل کشی ودلآویزی سے معمور اور ادبی حیثیت سے بلند پایہ ہوتی تھیں، ان میں ادب وانشا کا جوہر، شعر وسخن سے دل چسپی، دیدہ وری اور نکتہ رسی شروع ہی سے موجود تھی، وہ عام علما کی طرح نہیں تھے جن کو اردو شعر وادب اور سخن شناسی وشعر فہمی سے مناسبت نہیں ہوتی ہے ان کی تمام دعوتی واصلاحی تحریریں، ادب وانشا کے بانکپن، لطافت فکر، رعنائی خیال اور جادو بیانی سے آراستہ ہوتی تھیں، نہوں نے شاعری نہیں کی، گو کہ ان کی شاعرانہ طبیعت اپنے زمانہ طالب علمی میں اس ''وادی فکر وخیال'' کی سمت بری طرح مائل تھی............ تاہم مولانا نے بوجوہ یہ راہ ترک کر دی، انہیں شعر وسخن کے اصول وفروع اور فنی زاکتوں سے پوری طرح واقفیت تھی، اقبال اور ان کے اردو وفارسی کلام پر ان کی گہری نظر تھی بلکہ وہ ماہر اقبالیات تھے، شعری وادبی حلقوں میں بھی وہ مانے گئے اور ارباب دین ودانش کے درمیان بھی ان کی اقبال شناسی تسلیم کی گئی، اقبال کا بیشتر کلام ان کے حافظہ کے خزانہ میں محفوظ تھا، اقبال شناسی کی وساطت سے وہ اسرارِ خداوندی کے محرم اور

رموزِ فطرت کے آشنا تھے، بقول شاعر ؂

کھل جائیں گے شکیل اس پر اسرارِ خداوندی
اقبال کے اشعار انسان اگر سمجھے

اقبال کے علاوہ وہ بیسیوں شعراء کے اصلاحی اور تعمیری اشعار ان کے ذہن میں مستحضر رہتے اور برجستہ اور مناسب حال شعر وہ اس طرح استعمال کرتے جیسے وہ شعر اسی موقع کے لیے کہا گیا ہو، خواجہ حسن نظامی، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا گیلانی وغیرہ کا طرز تحریر اور علمی انداز انہیں بہت پسند تھا، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے ادبی اسلوب کے وہ دلدادہ تھے، زبان و بیان پر ان کی قدرت اور اس میں ان کی ندرت کے وہ قائل تھے۔

مولانا ایک بلند پایہ خطیب اور مقرر بھی تھے، ان کی تقریر، فصاحت و بلاغت کے ساتھ علمیت کے جوہر سے آراستہ ہوتی تھی ان کی آواز گرج دار تو نہیں تھی، مگر ان کی سنجیدہ گفتاری اور خوش بیانی متاثر کن ہوتی تھی کبھی موقع کی مناسبت سے انداز بیاں پر جوش اور مؤثر ہو جاتا تھا، عالمانہ رنگ و آہنگ اور خطیبانہ زیر و بم کے ساتھ تقریر میں علم وادب کا امتزاج نظر آتا تھا، ان کی تحریر و تقریر دونوں کی پشت پر مطالعہ کی قوت، اسلوب کی اثر آفرینی، الفاظ کی بندش، استعارات و تعلیمات اور بیان و بدائع کی جامعیت نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی، اپنی بات کو مؤثر بنانے کے لیے غالب و اقبال، میر و جگر، صفی و حالی، اکبرالہ آبادی اور امجد حیدرآبادی جیسے نامور شعراء کے اشعار بڑی خوبصورتی اور بہت ہی دل نشیں انداز میں موقع بہ موقع پڑھتے، قرآنی آیات اور نبویؐ روایات کے ساتھ اسلامی تاریخی نقوش، سلف صالحین اور اکابر علمائے دیوبند کے واقعات، جو معاشرہ کی اصلاح، ملی فلاح و بہبود اور کردار عمل کے فروغ میں معاون اور اثر انگیز ثابت ہوں، کو نہایت مرتب انداز میں پیش کرتے، امت کا اتحاد، معاشرہ کی اصلاح، انسانیت کی تعمیر، نئی نسل کی دینی تربیت، موجودہ حالات میں صبر و ثبات کی ضرورت، معاملات کی درستگی، مدارسِ اسلامیہ کی اہمیت اور ان جیسے تعمیری و اصلاحی موضوعات پر وہ اکثر لکھتے اور بولتے رہے، ان کی خطابت و تقریر کی یہی وہ لذت تھی جو حاضرین اور سامعین کے دل میں اپنے لیے جگہ بنا لیتی تھی، وہ ملک کے طول و عرض میں درس گاہوں، تحریکوں اور اداروں کی جانب سے خطبات کے لیے مدعو کیے جاتے تھے، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے بعض عمومی اجلاس کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظامت بھی کی ہے اور بورڈ کے جلسوں کو انہوں نے اپنی تقریروں سے گرمایا بھی ہے، ملی کونسل کے پلیٹ فارم سے قوم و ملت کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور بیدار کیا ہے، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، جامعہ ہمدرد اور جامعہ ملیہ جیسی باوقار دانش گاہوں میں بھی انہیں پورے انہماک کے ساتھ سنا گیا، بہر حال ایک بات جو ان کی ہر تقریر اور ہر تحریر میں ابھری ہوئی نظر آتی ہے، وہ ہے ان کے علم کی گہرائی اور نظر کی توانائی، جس سے ان کے دماغ کی پہنائی

کا اندازہ ہوتا ہے، سچ کہا ہے صفی نے ۔

تاثیر سخن کسب سے حاصل نہیں ہوتی
یہ دین خدا کی ہے صفی جس کو خدا دے

مولانا کی شخصیت میں دین وادب کا ایسا ہی حسین امتزاج پایا جاتا تھا جیسے کسی سرخ گلاب کی پتیوں میں بوئے گل اور رنگ گل، اپنی باوقار شخصیت کے ساتھ وہ ہر جگہ ممتاز نظر آتے، اصحاب علم وتحقیق میں عالم ذی وقار، شعر وادب کی بزم میں ادیب باکمال، علما وقائدین کے حلقہ میں زعیم بے مثال، وہ مرنجان مرنج شخصیت کے حامل تھے، وہ جہاں جاتے اپنی خوش اخلاقی، خوش گفتاری اور جادو بیانی کا جادو جگاتے، راقم نے ملک وبیرون ملک کی مجلس میں اور اصحاب دین ودانش کی محافل میں دیکھا کہ اپنی معتدل فکر اور متوازن شخصیت کے باعث وہ ہر جگہ عزت واحترام کی نظر سے دیکھے گئے، جدید تعلیم یافتہ اور عصری درس گاہوں کے فضلا سے بے تکلف مخاطب ہوتے، اسلامی علوم کے وسیع مطالعہ اور قرآن وسنت پر گہری نظر رکھنے کے سبب ان کی گفتگو میں حلاوت وتاثیر اور شانِ دل نوازی پائی جاتی تھی، اپنی بات کو سلیقہ، قرینہ اور ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کا انہیں خوب ملکہ تھا، وہ عصر جدید کے تقاضوں اور دانش حاضر کی زبان واسلوب سے پورے طور پر واقف تھے، وہ ان لوگوں میں سے تھے جو قدیم وجدید کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے صالح ونافع پہلوؤں کو اپنا لیتے ہیں، مسائل پر قابو پانے اور الجھی ہوئی گتھیوں کو حکمت، تدبر اور دانش مندی کے ساتھ سلجھانے کا ہنر جانتے تھے، کسی بھی معاملہ میں حوصلہ مندانہ جدوجہد کے ساتھ ''گوہر مقصود'' کو پانے اور ''ساحل مراد'' سے ہمکنار ہونے کا سراغ وہ جانتے تھے اور یہ راز بھی کہ ۔

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

مولانا مرحوم آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، آل انڈیا ملی کونسل، تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند اور اسلامک فقہ اکیڈمی جیسے باوقار اداروں سے ذمہ دارانہ وابستگی رکھتے تھے، عمر کے آخری حصہ میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی منتخب کر لیے گئے تھے، اہل علم کے حلقوں میں وہ اپنی اصابت رائے، اعتدال فکر ونظر، وسعت مطالعہ، باخبری اور عصری آگہی کی وجہ سے امتیازی شان رکھتے تھے اپنی ان تمام ذمہ دارانہ حیثیتوں کے باوجود وہ ایک غیر متنازع فیہ شخصیت سمجھے جاتے تھے، ملی مسائل اور سماجی امور میں انہماک وتوجہ کے ساتھ وہ ضرور حصہ لیتے، مگر سیاست کی پرخار وادی میں انہوں نے کبھی اپنے دامن کو الجھنے نہ دیا اور نہ کسی سیاسی محاذ سے خود کو وابستہ کیا، معاصر اہل علم کے درمیان جس چیز میں وہ سب سے زیادہ ممتاز تھے، وہ ان کا حسن تدبر، دوراندیشی، معاملہ فہمی اور فکر ورائے کی قوت تھی۔

مولانا کی شخصیت کا ایک اہم پہلوان کی قلمی، تحریری، صحافتی اور تصنیفی صلاحیت تھی، ان کی تحریری وقلمی خصوصیات کے جائزہ کا یہ موقع نہیں، علمی وادبی دنیا میں ایک ممتاز ادیب وانشا پرداز کی حیثیت سے وہ جانے اور مانے گئے، دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کی وجہ سے افسوس ہے کہ وہ قلم وتحریر کے لیے زیادہ وقت نہ نکال سکے، ورنہ شاید وہ عظیم وضخیم کتابوں کے مصنف ہوتے، تاہم اپنی مشغولیات کے باوجود اصلاحی وادبی مضامین اور علمی مقالات کے لیے وہ وقت نکال لیتے تھے، روزنامہ ''نوید'' دکن کے دینی صفحہ کی ذمہ داری خوش اسلوب سے نبھائی، پھر اس کے بعد ''روزنامہ ''سیاست'' کے لیے وہ مضامین لکھتے رہے، ادھر چند برسوں سے ''آپ کے سوال'' کے زیرِ عنوان ان کا ہفتہ واری کالم بھی شائع ہوتا رہا اور ادبی صفحہ میں بھی ان کی تحریریں نگاہ شوق کے لیے سرور وتسکین کا سامان فراہم کرتی رہیں، آندھرا پردیش کے علاقہ میں علما کی نمائندہ جماعت مجلس علمیہ کے دینی واصلاحی ترجمان ''قرطاس وقلم'' اور سبیل السلام کے سہ ماہی ''صفا'' کی ادارت بھی مولانا کے ذمہ تھی، دعوت واصلاح، تعلیم وتربیت، تزکیہ واحسان، ادب واخلاق، یہ سب مولانا کی تحریروں کے موضوعات ہوتے تھے، ان کے قلم گہر بار نے ''اسرارِ حیات'' سے پردہ اٹھایا ہے اور زندگی کو اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو میں بسانے کے لیے ''گلدستۂ سنت'' بھی ترتیب دیا ہے، وقت کے تغیر، زمانہ کی رفتار اور زندگی کے قافلہ کی تیز گامی سے بے خبر اور آنے والے ''کل'' کی تیاری سے غافل انسان کو یہ پیام بھی سنایا کہ ''اے انسان! وقت کی قیمت پہچان'' اور مسافرانِ آخرت کو ''سفرِ آخرت'' کی داستان بھی سنائی، جرم وسزا کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے ''مرض اور علاج'' کی تشخیص بھی کی ہے اور ''عصرِ حاضر میں دینی مدارس'' کے لے نشانِ راہ بھی متعین کیے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی یہ تحریریں گم کردہ راہ انسانیت کے لیے ''چراغِ راہ'' اور اپنی افادیت، نافعیت اور اصلاح وانقلابِ امت کی راہ میں اپنی اہمیت ووقعت کے لحاظ سے ''گنجہائے گرانمایہ'' کی حیثیت رکھتی ہیں، مولانا کی یہ تحریریں بیش قیمت علمی تحفہ ہیں جو انہوں نے دین وملت کی نسبت سے لکھی ہیں اور دین کی امانت کو ''متاعِ قلم'' کی صورت دیتے ہوئے امت کے سپرد کی ہیں، افسوس ہے کہ مولانا آج دنیا میں نہیں رہے، خدا ان کے درجات بلند فرمائے اور قوم وملت کے لیے انہوں نے جو آثار اور علمی یادگار چھوڑی ہے اس کا سلسلۂ فیض جاری رہے۔

اہلِ وفا ہر راہ گزر میں نقشِ قدم چھوڑ آئے ہیں اپنے
بعد فنا بھی ذکر ان کا ہوتا رہے گا عالَم عالَم

☆☆☆